

۱۲
درس

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

عائلی زندگی کے بنیادی اصول

سورۃ التحریم کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی — درس ۱۲

عائلی زندگی کے بنیادی اصول

سُورَةُ التَّحْرِيمِ کی روشنی میں

مفرد و مستند

ڈاکٹر اسرار احمد



مکتبہ خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 3-5869501

اس کتابچے کی اشاعت و طباعت کی ہر شخص کو مکمل اجازت ہے

نام کتابچہ _____ عالمی زندگی کے بنیادی اصول (درس 12)

طبع اول (ستمبر 1999ء) _____ 2200

طبع دوم (مارچ 2005ء) _____ 2200

طبع سوم (جون 2008ء) _____ 2200

ناشر _____ ناظم نشر و اشاعت مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت _____ 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: 3-5869501

مطبع _____ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت _____ 20 روپے

email: publications@tanzeem.org

website: www.tanzeem.org

عائلی زندگی کے بنیادی اصول

سورۃ التحریم کی روشنی میں

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد:

اعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ - بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ؕ تَبَيَّنَ لَكَ ؕ تَبَيَّنَ مَرَضَاتُ أَزْوَاجِكَ ؕ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١﴾ قَدْ بَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ ؕ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿٢﴾﴾ صدق الله العظیم

”اے نبی (ﷺ)! آپ کیوں حرام کرتے ہیں وہ چیز جو اللہ نے آپ کے لیے حلال ٹھہرائی ہے! اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ اللہ نے تمہاری قسموں کو کھولنے کے لیے طریقہ صحت کر دیا ہے اور اللہ ہی تمہارا پشت پناہ اور مددگار ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا اور کمال حکمت والا ہے۔“

سورۃ التحریم اٹھائیسویں پارے کی آخری سورۃ ہے۔ اور مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا درس ان مجالس میں سلسلہ وار ہو رہا ہے اس کا بحیثیت مجموعی یہ بارہواں درس ہے اور تیسرے حصے یعنی ”مباحث عمل صالح“ کا تیسرا درس ہے۔ اس منتخب نصاب کے جن دروس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں ان کے درمیان جو محتوی ربط و تعلق اور منطقی ترتیب ہے اس کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے!

اس منتخب نصاب کا پہلا حصہ چار جامع اسباق پر مشتمل ہے جس میں انسان کی کامیابی اور فوز و فلاح کے چاروں لوازم یعنی ایمان، عمل صالح، توامی بالحق اور توامی بالصبر کا بیان ہے۔ دوسرے حصے میں چند ایسے مقامات شامل ہیں جو خاص طور پر ایمان

کے مباحث سے متعلق ہیں۔ تیسرے حصے میں اعمالِ صالحہ کی بحث ہے جو جاری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ انسانی اعمال میں سب سے پہلے انفرادی سیرت و کردار کا معاملہ زیر بحث آنا چاہیے۔ چنانچہ اس حصے کے پہلے دو اسباق میں انفرادی سیرت و کردار ہی سے متعلق چند اہم پہلو سامنے آئے ہیں۔ اولین درس جو سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۃ المعارج کی درمیانی سترہ ہم مضمون آیات پر مشتمل ہے میں قرآن نے تعمیر سیرت کے لیے جو بنیادیں فراہم کی ہیں اور تعمیر خودی کا جو پروگرام دیا ہے اس کا بیان ہے اور سورۃ الفرقان کے آخری رکوع پر مشتمل دوسرے سبق میں یہ بات ہمارے سامنے آئی کہ ایک مکمل طور پر تعمیر شدہ بندہ مؤمن کی شخصیت کے کیا خدو خال ہونے چاہئیں! یعنی قرآن مجید کا انسان مطلوب کیا ہے جسے علامہ اقبال مرد مؤمن سے تعبیر کرتے ہیں۔

اب ہم انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اجتماعیت کی پہلی منزل خاندان اور عائلی نظام ہے۔ اس سے آگے معاشرہ اور پھر اس سے آگے ریاست ہے۔ یہ سارے اس اجتماعیت کے مدارج ہیں جس کا نقطہ آغاز خاندان ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ خاندان کی بنیاد روضۂ ازدواج سے پڑتی ہے یعنی ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان شوہر اور بیوی کا تعلق ایک خاندان کا سنگ بنیاد بنتا ہے۔

چونکہ اجتماعیت کا اولین قدم بھی ہے لہذا قرآن مجید میں عائلی نظام سے متعلق مباحث نہایت شرح و بیض اور تفصیل کے ساتھ آئے ہیں اور شوہر و بیوی کے رشتے کے متعلق معاملات اور نکاح و طلاق کے احکام و مسائل کے بارے میں تفصیلی ہدایات بیان ہوئی ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں کئی رکوع اسی بحث پر مشتمل ہیں۔ پھر سورۃ النساء سورۃ المائدۃ سورۃ الاحزاب سورۃ المجادلۃ سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم میں اس موضوع پر گفتگو آئی ہے۔ فارسی کے اس مشہور شعر کے مصداق کہ۔

خشبِ اول چوں نہد معمار هیچ
تا شیا می رود دیوار هیچ

چونکہ خاندان انسانی معاشرے اور انسانی تہذیب و تمدن کا بنیادی پتھر ہے اور اسی پر ریاست، ملت اور اجتماعیت کے تمام تصورات کی تعمیر ہوتی ہے لہذا اگر خاندان کے ادارے کی تعمیر میں کوئی کمی یا ٹیڑھ رہ جائے تو ظاہر بات ہے کہ پھر وہ کچی آخربک جائے گی۔ جزا اور بنیاد میں ضعف رہ جائے تو یہ ضعف معاشرے کی تمام سطحوں پر ظہور کرے گا۔ لہذا قرآن مجید خاندان کے اس ادارے کو نہایت مضبوط کرنا چاہتا ہے اور اسے نہایت صحیح بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے تاکہ اس میں نہ کوئی عدم توازن رہے نہ ہی کوئی اونچ نیچ ہو نہ ظلم و تعدی ہو اور نہ ہی یہ ضعف و اضمحلال کا شکار ہو۔

قرآن کریم کے اٹھائیسویں پارے کے آخر میں اس موضوع پر سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم کی صورت میں دو نہایت حسین و جمیل سورتوں کا جوڑا ہمارے سامنے آتا ہے۔ ظاہر بات ہے جتنی سورتوں یعنی سورۃ البقرۃ، سورۃ النساء وغیرہ جن میں عائلی زندگی کے معاملات پر بحث کی گئی ہے ان پر اس محدود وقت میں گفتگو نہیں ہو سکتی۔ البتہ سورۃ التحریم (جس کا مطالعہ آج کی اس نشست سے شروع ہو رہا ہے) کی ہر آیت کا ہم قدرے تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ لیکن اس سے قبل میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس سے ان شاء اللہ آپ کو فہم قرآن کے لیے رہنمائی ملے گی اور قرآن مجید کی آیات اور سورتوں میں جو باہمی ربط اور نظم ہے اس کے بارے میں آپ کو ایک بصیرت باطنی حاصل ہوگی۔ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ اب جوڑے ہونے کی نسبت کا تقاضا ہے کہ موضوع زیر بحث کے دو پہلو ہونے چاہئیں۔ ایک یہ کہ مشابہت بھی ہو اور دوسرے یہ کہ ان میں ایک تقسیم بھی ہو۔ یعنی تصویر کا ایک رخ یا ایک پہلو اگر ایک سورت میں آیا ہے تو اس کا دوسرا رخ اور دوسرا پہلو دوسری سورت میں آئے۔ جیسے قرآن مجید کی آخری دو سورتیں ”معوذتین“ ہیں۔ ان دونوں کا مضمون ایک ہی ہے۔ تعوذ کا ایک پہلو سورۃ الفلق میں آ گیا ہے یعنی اُن دہانوں اور بلاؤں سے پناہ کے لیے اللہ سے دعا کرنا جو انسان پر خارج سے حملہ آور ہوتی ہیں۔ اور تعوذ کا دوسرا رخ سورۃ الناس میں آ گیا ہے یعنی اُن دوسلوں اور بہکادوں سے پناہ کے لیے اللہ

سے دعا کرنا جو شیطان اور اس کی صلیبی و معنوی اولاد انسان کے دل و دماغ اور باطن میں پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح عائلی زندگی کے بھی دو پہلو ہیں، جنہیں تصویر کے دو رخ یا معاملات کے دو اجزاء کہہ لیجئے، جو سورۃ الطلاق اور سورۃ التحريم میں سامنے آتے ہیں۔

اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ان سورتوں کا بنیادی اور مرکزی مضمون کیا ہے! خاندان کے جذبات کا لحاظ رکھنا اور ایک دوسرے کے احساسات کا پاس کرنا ایک بنیادی قدر ہے۔ جس گھر میں شوہر اور بیوی کے مابین یہ کیفیت نہیں ہے تو یوں سمجھئے کہ زبردستی اور مارے باندھے کا ایک رشتہ ہے جو قائم ہے۔ اس رشتہ میں چاشنی اور باہم محبت و الفت درکار ہے۔ اگر وہ موجود نہیں ہے تو ایسا گھر اس دنیا میں جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔ الغرض عائلی زندگی میں دورویے ہیں جن میں انسان انتہا تک چلا جاتا ہے۔ ایک رو یہ یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان عدم موافقت ہے، دونوں کے مزاجوں میں کوئی ایسا بند ہے کہ باہم موافقت نہیں ہو پارہی تو اس کی انتہا طلاق ہے۔ یہ مضمون سورۃ الطلاق میں آیا ہے۔ سورۃ التحريم اور سورۃ الطلاق میں مشابہت دیکھئے کہ دونوں کے آغاز میں براہ راست نبی اکرم ﷺ سے خطاب کیا گیا ہے۔ البتہ سورۃ الطلاق کے شروع میں طلاق کا ذکر ہے، مگر چونکہ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں طلاق کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں لہذا شروع میں تو خطاب آنحضرت ﷺ سے ہے لیکن فوراً بعد ہی ﴿إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ﴾ سے آخر آیت تک جمع کا صیغہ آیا ہے۔ یعنی دراصل یہ بات رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے آپ کی وساطت سے مسلمانوں سے کہی جا رہی ہے کہ اے مسلمانو! اگر تمہارے یہاں کوئی اس قسم کی صورت حال پیش آجائے کہ طلاق ناگزیر ہو جائے تو یہ روش اختیار کرو یہ اس کے قواعد و ضوابط اور شرائط و آداب ہیں۔

یہ بات تمدنی اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ بعض معاشروں اور بعض مذاہب نے طلاق کو عائلی زندگی سے خارج کر دیا ہے، جبکہ اسلام کا نظام بڑا متوازن اور معتدل ہے۔ اسلام کے عائلی نظام میں ایک طرف تو طلاق کو حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور مبغوض چیز کہا گیا ہے اور ساتھ ہی بیوی کی ناپسندیدہ عادتوں سے

صرف نظر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک حدیث شریف میں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی اکرم ﷺ نے بطور اہتمام فرمایا:

((لَا يَقْرَأُ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً إِنْ كَرِهَتْ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ))^(۱)

یعنی کسی مؤمن کو اپنی بیوی سے اس کی کسی ناپسندیدہ عادت کی وجہ سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اگر اس کی کوئی ایک عادت اسے ناپسند ہے تو اس کی کوئی دوسری عادت اسے اچھی بھی تو لگتی ہے۔

اس ابرہاد رسول ﷺ کی روشنی میں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جانین ایک دوسرے کی خوبیوں اور بھلائیوں پر نگاہ رکھیں تاکہ حتی الامکان کوشش ہو سکے کہ ان کے درمیان موافقت پیدا ہو جائے۔ لیکن اگر کوشش کے باوجود کسی وجہ سے موافقت پیدا نہیں ہو رہی تو پھر اسلام ان دونوں کو زبردستی باندھ کر رکھنا نہیں چاہتا۔ اس زبردستی کے بندھن سے معاشرے میں خیر پیدا نہیں ہوتا، شر پیدا ہوتا ہے، لہذا اطلاق کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ البتہ اس کے جو قواعد و ضوابط اور آداب و شرائط ہیں انہیں بھی قرآن میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ان آداب و شرائط کو ہمارے معاشرے میں عام طور پر ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور کوئی شوہر غصہ میں آ کر ایک ہی وقت میں آخری قدم اٹھا بیٹھتا ہے اور ایک دفعہ ہی تین طلاقیں دے دیتا ہے اور بعد میں پچھتا تا ہے۔

دوسری طرف عائلی زندگی میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کی دلجوئی اور خوشنودی حاصل کرنے کا معاملہ حد اعتدال سے بڑھ جائے اور شوہر اپنی بیوی کی رضا جوئی میں اس حد تک چلا جائے کہ شریعت کے احکام ٹوٹنے لگیں۔ مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی کو خوش اور راضی کرنے کے لیے یا اس کی کوئی فرمائش پوری کرنے کے لیے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال ٹھہرالے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا دوسرے سے کوئی امکان نبی اکرم ﷺ کے لیے نہیں تھا، معاذ اللہ، معاذ اللہ۔ البتہ آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا جس میں آپ ﷺ نے اپنی بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن

کی دلجوئی طوطا رکھی۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ پسندیدہ اور مطلوب ہے، آپ ﷺ نے اس کی ترمیم دی ہے رسالت مآب ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ((عَمْرُكُمْ عَمْرُكُمْ لَا هَيْبَةَ وَآتَا عَمْرُكُمْ لَا هَيْبَةَ))^(۱) ”تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنے گمراہوں کے حق میں بہترین طرز عمل اختیار کرنے والے ہیں اور جان لو کہ میں تم میں سے اپنے گمراہوں کے لیے بہترین روش اختیار کرنے والا ہوں۔“ اگرچہ یہ ایک پسندیدہ طرز عمل ہے مگر ایک خاص واقعہ میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فہمائش کی گئی۔ اس لیے کہ حضرت یعقوب رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں یہ ہو چکا تھا کہ انہوں نے اپنے ذاتی ذوق کی بنا پر اونٹ کے گوشت کا استعمال ترک کر دیا تھا لیکن یہود نے یہ سمجھ لیا کہ اونٹ کا گوشت حرام ہے۔ گویا ایک نبی کے ذاتی ذوق کے معاملہ کو شریعت کا جزو بنا لیا گیا اور اونٹ کے گوشت کی حرمت بنی اسرائیل کی شریعت میں مستقل ہو گئی۔

میں نے جس خاص واقعہ کا حوالہ دیا ہے وہ احادیث میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ سورۃ الاحقریم میں اس واقعہ کی طرف محض اشارہ ہے۔ احادیث مجھ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ عصر کی نماز کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے یہاں تشریف لے جاتے۔ ازواج مطہرات کو آپ کے ساتھ جو محبت اور جو تعلق خاطر تھا اس کے پیش نظر ہر زوجہ محترمہ کی یہی تمنا اور کوشش ہوتی تھی کہ وہ آنحضور ﷺ کی توجہات کا مرکز بنے اور زیادہ سے زیادہ وقت اسے رسول اللہ ﷺ کی بابرکت صحبت میں رہنے کا موقع نصیب ہو۔ لیکن آپ ﷺ اس معاملے میں کمال عدل سے کام لیتے تھے اور ہر زوجہ محترمہ کے یہاں مساوی وقت دیتے تھے۔ ایک روز رسول اللہ ﷺ کو حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے یہاں معمول سے زیادہ دیر لگی۔ ہوا یہ کہ ان کے یہاں کہیں سے ہدینا شہد آیا ہوا تھا اور حضور ﷺ کو چونکہ شہد بہت مرغوب تھا اس لیے اُم المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو شہد پیش کیا جس کے نوش فرمانے کے باعث آپ ان کے یہاں زیادہ دیر تک ٹھہرے۔ پھر کئی روز تک یہی

(۱) سنن الترمذی، کتاب الغناب عن رسول اللہ ﷺ، باب فضل ازواج النبی۔

معمول ہوا۔ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے مل کر تدبیر کی کہ آپ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے یہاں شہد چنا چھوڑ دیں تاکہ آپ ان کے یہاں معمول سے زیادہ وقت نہ دے سکیں۔ وہ شہد مغایر کے پھولوں کا تھا جس میں کچھ بساند اور ہونک ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہد کے استعمال کے بعد جب ان کے حجرے میں تشریف لے جاتے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتیں کہ آپ کے منہ سے مغایر کی بساند آتی ہے۔ ان دونوں نے چند دیگر ازواج مطہرات کو بھی اس میں شریک کر لیا۔ آپ چونکہ نہایت نفاست پسند تھے اور جب آپ کی متعدد ازواج مطہرات نے یہ بات کہی تو آپ نے عہد کر لیا اور قسم کھالی کہ آئندہ آپ یہ شہد استعمال نہیں فرمائیں گے۔

ہمارے دین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مقام حاصل ہے کہ اگر آپ سے کوئی معمولی بات بھی ظہور میں آجائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اب آپ نے چونکہ اپنی ازواج مطہرات کی خوشنودی کے لیے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ ایک شے اپنے اوپر حرام کی تھی اس لیے یہ خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ امت اس شے کو ہمیشہ کے لیے حرام یا کم از کم حد درجہ مکروہ سمجھنے لگے یا امت کے لوگ یہ خیال کرنے لگیں کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز اپنے اوپر حرام کر لینے کی دین میں اجازت ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ مبارکہ نازل فرما کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام پر ٹوک دیا۔

اس ٹوکے سے متعلق یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنے کے مطلق اور قطعی اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ نبی بھی اگر کسی شے کو حلال یا حرام قرار دیتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو، خواہ وہ اشارہ وحی جلی کی صورت میں ہو، یا وحی خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔

اس سورہ مبارکہ پر تدبیر کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب ایک ذرا سی بات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف ٹوک دیا گیا اور اس کی اصلاح کی گئی بلکہ اس کا ایک سورہ میں ذکر کر کے اس کو ابد الابد تک کے لیے قرآن مجید میں محفوظ کر دیا گیا تو اس

سے قطعی طور پر یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے جن اعمال افعال احکام اور ہدایات پر قرآن مجید میں کوئی گرفت یا اصلاح موجود نہیں ہے وہ سراسر حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی منشاء و مرضی کے مطابق ہیں اور ان کا اتباع ہم پر لازم ہے۔ اس بات سے سنت کی حجت و فرضیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

ان تمہیدی باتوں کے بعد اب ہم اس سورہ مبارکہ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ فرمایا: ﴿بَلَّغْنَا النّبِيَّ لِمَ نُنْهَىٰ عَنْهَا لَعَلَّ اللَّهُ لَكَ ءِذْرًا﴾ ”اے نبی (ﷺ)! آپ اس چیز کو کیوں حرام ٹھہراتے ہیں جسے اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے؟“ اعدا از استفہامیہ ہے لیکن مقصود آنحضرت ﷺ کو نوکنا اور متنبہ کرنا ہے۔ ﴿وَلَتَبْلُغُنَّ مَرَضَاتٍ أَرْوَا جِبْكَ﴾ ”کیا آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں؟“ آیت کے اس حصہ سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا یہ فعل اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر نہیں تھا بلکہ بیویوں کی خوشنودی کی وجہ سے تھا جنہوں نے یہ صرف اس لیے چاہا تھا کہ آپ ﷺ پینے کی خاطر حضرت زینبؓ کے ہاں زیادہ دیر قیام نہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سبب کو یہاں بیان فرما کر ازواج مطہرات کو متنبہ فرمادیا کہ وہ نبی کی ازواج ہونے کی نازک ذمہ داریوں کا لحاظ رکھیں۔ آگے فرمایا: ﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ”اور اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے“۔ آیت کے اس حصہ میں نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ نے اپنی بیویوں کی خوشنودی کی خاطر ایک حلال چیز کو حرام قرار دینے کا جو کام کیا ہے وہ کوئی گناہ نہ تھا لیکن آپ کے منصب کی اہم ترین ذمہ داریوں کے اعتبار سے مناسب نہ تھا لہذا اللہ نے صرف نوک کر اصلاح کی طرف متوجہ کرنے پر اکتفا فرمایا۔

اس مقام پر ٹھہر کر ذرا اس بات پر غور فرمائیے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو اپنی ازواج کی خوشنودی کی خاطر ایک حلال چیز کو اپنے لیے حرام قرار دینے پر اس شدہ دمہ کے ساتھ نوک دیا گیا ہے تو ان لوگوں کا آخرت میں کتنا سخت اور شدید مواخذہ ہوگا جو اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے حرام کو حلال کر لیتے ہیں اور پھر اس کا مسلسل اور مستقل ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا: ﴿لَقَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ﴾ "اللہ ایسی قسموں کو کھولنے کا ایک راستہ تمہارے لیے مقرر کر چکا ہے"۔ اس میں سورۃ المائدہ کی آیت ۸۹ کی طرف اشارہ ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی قسم کھالی ہے اور اب اس کو کھولنا ہے تو اس کے لیے کفارہ مقرر ہے اور وہ یہ کہ دس مساکین کو کھانا کھلائے۔ وہ کھانا ایسا ہو جو انسان اپنے اہل و عیال کو کھلاتا ہے۔ یا دس مساکین کو لباس مہیا کرے۔ یا کسی ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرائے۔ اور اگر کسی کو ان میں سے کسی کی بھی استطاعت نہ ہو تو اس کا بدلہ یہ مقرر کیا گیا کہ ایسا شخص تین دن کے روزے رکھے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قسم کو کھولنے اور عہد کی پابندی سے نکلنے کا اللہ تعالیٰ طریقہ معین فرما چکا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی ایسی صورت پیش آ جائے تو کفارہ ادا کر کے قسم کھول دو۔ آگے فرمایا: ﴿وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ﴾ "اور (یہ بات جان لیجئے کہ) آپ کا اور سب مسلمانوں کا مددگار (حامی اور پشت پناہ) صرف اللہ ہی ہے"۔ لہذا اسی کی رضا اور خوشنودی کو ہمیشہ مقدم رکھنا چاہیے۔ ﴿وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾ "اور وہی ہے سب کچھ جاننے والا کمال حکمت والا"۔ یعنی وہ جو بھی حکم دیتا ہے اپنے علم کمال کی بنیاد پر دیتا ہے اور اس کی حکمت باللہ اس حکم میں شامل ہوتی ہے۔

سورۃ التحریم کی ابتدائی دو آیات میں ہمارے سامنے خاندانی و عائلی زندگی کے بارے میں ایک بڑی بنیادی بات آگئی کہ بیویوں کی رضا جوئی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا ان کے ساتھ نرمی و محبت، موذت، الفت اور ان کے جذبات کا پاس اور لحاظ رکھنا یہ تمام چیزیں اصلاً مطلوب اور پسندیدہ ہیں، لیکن ایک خاص حد تک۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں یہ جذبہ حد اعتدال سے تجاوز کر جائے اور شریعت کے احکام ٹوٹنے شروع ہو جائیں۔ لہذا ایک بندہ مؤمن کو ہمیشہ اور ہر وقت اعتدال کی روش اختیار کرنی چاہیے اور اس معاملہ میں ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔ آیات ۵۲۳ میں فرمایا:

﴿وَإِذْ أَسْرَأَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا ۖ فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ۖ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ

هَذَا قَالَ نَبِيُّ الْعَالَمِ الْخَيْرِ ⑤ إِنَّ تَوْبَتِي إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَفَتْ قُلُوبَكُمْ وَأَنَّ تَطَهَّرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ ⑥ عَسَى رَبُّهُ إِنْ طَلَقْتُكَ أَنْ يَبْدُلَهُ آزْوَاجًا خَيْرًا مِمَّنْكَ مُسْلِمَاتٍ مُؤْمِنَاتٍ قَنَاطٍ تِهَابٍ عِلْدَانٍ مُسَبِّحَاتٍ يَمْحُونَ وَابْتِغَاءً ⑦﴾

”اور جب نبی (ﷺ) نے ایک بات اپنی بیوی سے راز میں کہی تھی پھر جب اُس بیوی نے وہ راز (کسی اور پر) ظاہر کر دیا اور اللہ نے نبی (ﷺ) کو اُس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی تو نبی (ﷺ) نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خیر دار کیا اور کسی حد تک اس سے دور گزر کیا۔ پھر جب نبی (ﷺ) نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا: آپ کو اس کی خبر کس نے دی؟ نبی (ﷺ) نے کہا ”مجھے اُس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا اور خوب باخبر ہے۔“ اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو (یہی تمہارے لیے زیبا ہے) تمہارے دل تو (خدا کی طرف) مائل ہی ہیں اور اگر تم نبی کے خلاف ایسا کرو گی تو اس کا حامی اللہ ہے اور جبریل اور تمام نیکو کار مسلمان اور مزید برآں فرشتے بھی اس کے مددگار ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تمہیں طلاق دے دے تو اُس کا پروردگار تمہارے بدلے میں تم سے بہتر بیویاں اس کو عطا کر دے اطاعت شعار مؤمنہ فرمانبردار تو بہ کرنے والیاں عبادت گزار ریاضت کرنے والیاں شوہر آشنا اور کنواریاں۔“

ان آیات میں نبی اکرم ﷺ کی عائلی زندگی کے ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ واقعہ کی تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ یہ آیات اپنے مفہوم و مدعا کو خود واضح کر رہی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے کوئی راز کی بات اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی ایک سے کہی اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرمادی کہ یہ بات کسی اور کو نہ بتائی جائے۔ ان زوجہ محترمہ سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے کسی دوسری زوجہ کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس افشائے راز کی خبر دے دی۔ اس پر حضور ﷺ نے نہایت ملامت، شفقت اور نرمی سے اُن زوجہ محترمہ کو اشارتا جتلا دیا کہ یہ

بات آپ کے علم میں آگئی ہے۔ ﴿عَرَفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضِهِ﴾ کے الفاظ میں آپ کے حسن معاشرت کی اعلیٰ مثال کا ذکر ہے کہ آپ نے پوری بات جتلا نا اور پورے کا پورا التزام دینا پسند نہ فرمایا۔ آپ نے شکوہ و شکایت میں بھی التفات و ملاحظہ کے پہلو کو پیش نظر رکھا، تاکہ ان زوجہ محترمہ کو انتباہ ہو جائے۔ اس پر ان زوجہ محترمہ نے پلٹ کر سوال کیا کہ ”آپ کو یہ کس نے بتایا؟“ ہو سکتا ہے کہ انہیں یہ گمان ہوا ہو کہ میں نے جن کو یہ بات بتائی تھی شاید انہوں نے حضور ﷺ کو بتادی۔ اس لیے اپنے شک اور سوئے ظن کو رفع کرنے کے لیے انہوں نے حضور ﷺ سے وضاحت چاہی کہ آپ کو کس نے بتایا!۔ اس کے جواب میں حضور ﷺ کے جو الفاظ آئے ہیں ان میں تھوڑا سا اظہار ناراضگی کا پہلو بھی ہے، کیونکہ یہ معاملہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ یہ مجھے کس نے بتایا، اصل بات تو یہ ہے کہ ایک راز کی بات تھی اسے راز ہی رہنا چاہیے تھا۔ لہذا حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: ”مجھے تو اس خدا نے بتایا ہے جو العظیم بھی ہے اور الخبیر بھی۔“ اس واقعے کے اجمالی ذکر کے بعد اب اللہ تعالیٰ کی جانب سے خطاب ہو رہا ہے۔

یہاں اس بات کو بھی جان لیجیے کہ عائلی زندگی میں مرد کا اپنی بیوی کے حق میں نرم ہونا، شفیق ہونا، شوہر اور بیوی کے درمیان محبت والفت و رحمت و شفقت اور موڈت کا پایا جانا مطلوب ہے۔ لیکن اس میں اگر شوہر کی طرف سے نرمی زیادہ ہو جائے اور خاندان کے ادارہ کو مستحکم رکھنے کا بنیادی اصول یعنی ﴿الْوَجَلُ قَوْمُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ کا اہتمام و التزام پوری طرح باقی نہ رہے تو خاندانی زندگی کے بنیادی ڈھانچے کو ضعف پہنچے گا۔ پھر جب معاملہ خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کا ہو تو اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے، کیونکہ آپ کا ہر عمل امت کے لیے نمونہ ہے۔ — سورة الحجرات میں بہت زور دے کر فرمایا گیا ہے کہ ﴿وَاعْلَمُوا أَنِّي فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ﴾ ”خوب جان لو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔“ اس میں ایک بڑا لطیف نکتہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کا تو ایک ہی پہلو ہے، کہ آپ اللہ کے نبی اور رسول ہیں اور ہم امتی ہیں، آپ ہمارے آقا ہیں، ہم آپ کے غلام ہیں اور تو کوئی رشتہ اور نسبت نہیں ہے! لیکن صحابہ کرام

اور صحابیات رضی اللہ عنہم کا معاملہ بہت مختلف تھا۔ صحابہؓ میں سے کوئی آنحضور ﷺ کا چچا بھی ہے، اب چچا ہونے کے اعتبار سے وہ بڑا ہے، حضورؐ بھیجے ہیں، بھیجے کارشتہ بہر حال چھوٹا ہے۔ اب اگر کہیں حضرت حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما اپنی اس حیثیت کو ماننے رکھتے ہوئے حضور ﷺ کے ساتھ کوئی ایسا طرز عمل اختیار کر لیتے جو بڑا اپنے چھوٹے کے ساتھ اختیار کرتا ہے تو حضور ﷺ کی حیثیت رسالت مجرد ہو سکتی تھی۔ لہذا آگاہ کر دیا گیا، متنبہ کر دیا گیا: ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ اچھی طرح جان رکھو کہ تمہارے مابین صرف محمدؐ نہیں ہیں، بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، لہذا آپؐ کی اس حیثیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو۔

اسی بات کا اطلاق ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن پر بھی ہوگا کہ بیوی ہونے کی حیثیت سے ان کی طرف سے ناز کا بھی اظہار ہو جائے گا۔ لہذا ان کو بھی متنبہ کر دیا گیا کہ ٹھیک ہے اے عائشہ! کہ محمد ﷺ تمہارے شوہر ہیں، اے حفصہ! ٹھیک ہے کہ محمد ﷺ تمہارے شوہر ہیں، لیکن ہر دم یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ اللہ کے رسول بھی ہیں اور یہ بہت نازک مقام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے احرام اور ادب کو کسی درجہ میں بھی ضعف پہنچنے کا امکان ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں ہمیشہ سخت ترین تنبیہ نظر آئے گی۔ جیسے سورۃ الحجرات میں ہے کہ:

﴿اِنَّ تَحَبُّطَ اَعْمَالِكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ (۱) ”مبادا تمہارے اعمال اکارت ہو جائیں اور تم کو خبر تک نہ ہو“۔ اگر معاملے کی یہ خاص صورت پیش نظر نہ ہو تو پھر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے کچھ سوائے ظن کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ حقائق جو میں نے بیان کیے ہیں اگر مد نظر رہیں تو پھر کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوگی۔

زیر بحث معاملہ دو ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے درمیان پیش آیا۔ ایک نے نبی ﷺ کا بتایا ہوا راز دوسری پر ظاہر کر دیا۔ اب دونوں کے لیے اللہ کا حکم ہے کہ: ﴿اِنْ تَوْبَا لَیْ اللّٰهِ فَقَدْ صَفَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ”اگر تم دونوں اللہ کی جناب میں توبہ کرو (اظہارِ عداوت کرو اور اللہ سے استغفار کرو) تو (مجھے تمہارے حق میں بہتر ہے، کیونکہ) تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں“۔ یعنی دلوں میں توبہ کی کیفیت ہے ہی، پشیمانی اور عداوت کے جذبات

تو ہیں ہی — لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی مان ہوتا ہے۔ وہی بات جسے میں نے ناز سے تعبیر کیا ہے۔ اس ناز کی وجہ سے ندامت اور پشیمانی کے الفاظ زبان پر نہیں آ رہے، طبیعت ہچکچا رہی ہے۔ تو گویا ترغیب کا یہ نہایت بلیغ انداز ہے کہ فرمایا گیا: ”تمہارے دل تو مائل ہو ہی گئے ہیں“۔ جیسے ہم کسی سے کہتے ہیں کہ ذرا مت کرو، اصل میدان تو تم سر کر ہی چکے ہو، کٹھن منزل تو تم نے طے کر لی ہے، اب تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے، بہت نہ بار، حوصلہ سے کام لے کر اس مرحلہ سے بھی گزر جاؤ۔

اس مقام پر بعض مفسرین کو سخت مغالطہ ہوا ہے۔ انہوں نے ”صَفَتْ“ کا مفہوم کسی شے سے انحراف سمجھا ہے، حالانکہ یہ لفظ کسی شے کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کا مفہوم رکھتا ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلوی نے بھی یہاں ”صَفَتْ“ کا ترجمہ ”جھک جانا“ کیا ہے۔ آیت کا اسلوب بھی یہی بتا رہا ہے کہ ”اگر تم اللہ کی جناب میں توبہ کرو تو تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں (جھک ہی چکے ہیں)“۔ ذرا سی یہ ہچکچاہٹ جو شوہر اور بیوی کے نفسیاتی تعلق کی وجہ سے حائل ہے، اس جھجک کو دور کرو اور اپنی خطا کا اعتراف کرو۔ اللہ سے بھی اس کے لیے استغفار کرو اور نبی ﷺ سے بھی معذرت کرو کہ ہم سے خطا ہوئی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں اگر بظاہر درشتی کا پہلو ہو، سختی کا اسلوب ہو تو دیکھنا یہ ہوگا کہ خطاب کن سے ہے، بسا اوقات شفقت اور محبت ہی کے اظہار کے لیے بظاہر سختی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک شفیق والد اپنے بچے کی تربیت کے لیے بعض اوقات سختی اور درشتی کا انداز اختیار کرتا ہے، لیکن کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ باپ کا دل اپنے بچے کی محبت سے خالی ہے؟ البتہ یہاں ایک بات یہ جان لیجئے کہ ع ”جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے“ کے مصداق جن کے مقامات بلند ہوتے ہیں ان کی چھوٹی سی بات پر بھی جب گرفت ہوتی ہے تو بظاہر انداز بڑا سخت ہوتا ہے۔ عربی کا ایک مقولہ ہے کہ ”حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقْرَبِينَ“ یعنی عام لوگوں کے لیے جو کام بڑی نیکی کا سمجھا جائے گا ہو سکتا ہے کہ وہی کام اللہ تعالیٰ کے

مقربین اولیاء اور محبوب بندوں کے لیے تقصیر قرار پائے اور ان کے مرتبہ کے اعتبار سے قابل گرفت شمار ہو جائے۔ لہذا یہ معاملہ مراتب اور درجات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ یہی اسلوب ہم قرآن مجید کے بعض مقامات پر دیکھتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کے ساتھ خطاب میں بھی بظاہر کچھ سختی کا اظہار ہو رہا ہے۔ جیسے:

﴿عَسَىٰ وَتَوَلَّىٰ ۙ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ ۗ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يُزَيِّجُكَ ۙ وَيَذَرُكَ أَتَقَفَّهٗ الذُّكْرَىٰ ۗ أَمَّا مَنِ اسْتَعْنَىٰ ۙ فَلَا نَافِعَ لَهُ تَصَدَّىٰ ۙ﴾

”ترش رو ہوا اور بے زنجی برتی۔ اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے! یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو! جو شخص بے پروائی برتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔“

بظاہر اس اسلوب میں کچھ سختی ہے، لیکن درحقیقت اس انداز میں محبت، شفقت اور عنایت پنہاں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے گرفت کا انداز نظر آتا ہے جبکہ بڑی معمولی بات ہے اور عام لوگوں کے لیے غلطی بھی نہیں ہے، لیکن رسول اور نبی ہونے کے اعتبار سے اس پر بھی روک ٹوک ہو رہی ہے اور بظاہر انداز سخت نظر آ رہا ہے۔ اسی اصول کا ہم یہاں بھی اطلاق کریں گے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنا مقام اور مرتبہ پہچانو، تم آہتات المؤمنین ہو پوری امت کی خواتین کے لیے قیامت تک تمہارا طرز عمل نمونے کا طرز عمل ہوگا۔ لہذا تمہارا طرز عمل بڑا اعلیٰ معیاری اور آبیڈیل ہونا چاہیے۔ اس میں ذرا سی کمی کسی پہلو سے بھی ہو تو ممکن ہے کہ وہ پہلو امت کی خواتین کے لیے بڑی بڑی لغزشوں کا سبب بن جائے۔ اس لیے یہاں الفاظ میں بظاہر کچھ سختی ہے، لیکن اس سے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں کوئی معمولی سا سوائے ظن بھی دل میں ہرگز پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

آیت مبارکہ کی طرف پھر رجوع کیجئے، فرمایا: ﴿إِنَّ تَوْبًا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَفَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ ”اگر تم اللہ کی جناب میں توبہ کرو تو تمہارے دل تو اس کی طرف مائل ہو ہی چکے ہیں۔“ ﴿وَإِنْ تَطَهَّرْنَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ﴾

”اور اگر تم ہمارے نبی کے خلاف ایکا کرو گی تو جان رکھو کہ اللہ خود اپنے رسول کا رفیق ہے پشت پناہ ہے اور ساتھ ہی جبریل ہیں (جو ملائکہ کے سردار ہیں) اور تمام مومنین صالحین (یعنی آپ کے اصحاب آپ کے پشت پناہ ہیں)۔“ ﴿وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ﴾ ﴿۵﴾

”اور اس کے بعد تمام ملائکہ بھی ہمارے نبی کے ساتھی اور مددگار ہیں“۔ یہاں اہل ایمان کا ذکر تو صالحیت کی صفت کے ساتھ کیا گیا ہے، لیکن ملائکہ کے لیے فرمایا کہ کُل کے کُل ملائکہ، کیونکہ وہ تو سب کے سب ہی صالح ہیں، ان کے بارے میں تو کوئی دوسری رائے ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کا معاملہ تو یہ ہے کہ: ﴿يَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ ﴿۶﴾ ”وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے“۔

آگے پھر وہی تہدید کا انداز چل رہا ہے جس میں ازواجِ مطہرات ﷺ کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی سامنے آتی ہے کہ تمہارے اندر جو یہ اوصاف ہیں کہ تم اطاعت شعار ہو، ایماندار ہو، فرمانبردار ہو، توبہ کرنے والیاں ہو، زہد و تقاوت اختیار کرنے والیاں ہو، ان پر تمہیں نازاں نہیں ہونا چاہیے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ اللہ تم جیسی یا تم سے بہتر خواتین اپنے نبی کے لیے ازواج کے طور پر فراہم نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں تمہیں بالفرض اپنے اسلام و ایمان پر اپنے تقویٰ و احسان پر اور اپنی نیکیوں اور عبادت گزار یوں پر زعم ہو گیا ہے (اگر اس کا کچھ بھی امکان ہے) تو جان لو کہ اگر نبی ﷺ تم سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیں تو اللہ ان کو تم جیسی بلکہ تم سے بھی بہتر بیویاں عطا کر سکتا ہے۔ یہ مفہوم ہے آیت کے ان الفاظ مبارکہ کا کہ ﴿عَسَىٰ رَبُّهُٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُدْخِلَکُمْ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْکُمْ مُّسْلِمٰتٍ مَّوْمِنٰتٍ قٰنِیٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰلِحٰتٍ بَیٰبِتٍ وَّابْکٰرًا﴾ ﴿۷﴾ ”نسیات“ ان خواتین کو کہا جاتا ہے جن کی ایک دفعہ شادی ہو چکی ہو، یعنی بیوہ یا مطلقہ ہوں اور ”ابکار“ سے کنواری خواتین مراد ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے حوالہ عقد میں اکثر خواتین شوہر آشنا تھیں لہذا ان کا ذکر بھی یہاں کر دیا گیا، کیونکہ ایک خاتون جسے متاہل زندگی کا تجربہ پہلے ہو چکا ہو بعض پہلوؤں سے اس کی رفاقت شوہر کے لیے آسانی کا موجب بن جاتی ہے۔ رہا ابکار یعنی کنواریوں کا معاملہ تو ہر شخص کے لیے کسی خاتون کا بیوی کی حیثیت سے یہ نہایت

پسندیدہ وصف ہے ہی۔

ان تین آیات میں ایک خاص واقعہ کے حوالے سے ازواجِ مطہرات سے خطاب کیا گیا ہے، جس سے یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ ازدواجی زندگی میں اگرچہ باہمی محبت والفت، شفقت و مودت ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا لحاظ حسن معاشرت اور نرمی کا سلوک مطلوب ہے، لیکن ایسا نہ ہو کہ اس کے نتیجے میں بیویوں میں شوخی کا انداز حد اعتدال سے تجاوز کر جائے اور ﴿الزَّجَالَ قَوْمُونَ عَلَىٰ النِّسَاءِ﴾ کا اصول مجروح ہو جائے جو ہماری خاندانی زندگی کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر خاندان کا ادارہ کمزور ہو جائے تو اس کے اثرات سارے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں اس لیے اس اصول کو ایک واقعے کے حوالے سے ذہن نشین کر دیا گیا ہے۔

عالمی زندگی کو صحیح بنیادوں پر استوار رکھنے اور ”گھر“ کو امن و سکون کا گہوارہ بنانے کے لیے ان آیات میں مسلمان عورتوں کو ایک اہم سبق یہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے رازوں کی امانت دار اور محافظ بنیں۔ قرآن میں ان کی صفت ”حَلِيفَتٌ لِّلْغَيْبِ“ یعنی ”رازوں کی حفاظت کرنے والیاں“ بتائی گئی ہے۔ بیوی فطری طور پر بھی گھر کے رازوں کی امین ہوتی ہے، لیکن اگر وہ خود ہی اس امانت کی حفاظت نہ کر سکے تو عالمی زندگی جن الجھنوں کا شکار ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

تر بیتِ اولاد اور والدین کی ذمہ داریاں

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴿٦١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْبُدُوا الْيَوْمَ إِلَّا إِنَّمَا نَعْبُدُ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٦٢﴾﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا

جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔ (اُس وقت کہا جائے گا کہ) اے کافرو! آج
مغذرتیں پیش نہ کرو تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جو عمل تم کیا کرتے تھے۔“

سورۃ التحریم کی چھٹی آیت میں ایک مسلمان خاندان کے سربراہ کی ذمہ داری مثبت
انداز میں امر کے صیغے میں بیان کی جا رہی ہے۔ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں یہ
مضمون دو مواقع پر پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ سورۃ النخابن میں اہل ایمان کو خبردار کیا گیا:
﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمِنَ أَرْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوٌّ لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ﴾ ”اے
اہل ایمان! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، پس
ان سے ہوشیار رہو“۔ اگرچہ ہماری اجتماعی زندگی کا جو نقشہ ہے اس کی بنیاد میں مال و
اولاد کی طبعی محبت ہی کا فرما ہے۔ یہ محبت اپنی جگہ صحیح اور درست ہے، لیکن بسا اوقات یہ
طبعی و فطری محبت حدِ اعتدال سے تجاوز کر کے اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ انسان اپنے اہل
و عیال کی محبت کی وجہ سے اللہ کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی
فرمائش پوری کرنے، اولاد کو اچھے سے اچھا کھلانے پلانے اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے
کے لیے انسان حرام میں مُنہ مارنے لگتا ہے۔ گویا یہ محبت نتیجہ کے اعتبار سے اس کے لیے
محبت نہیں بلکہ عداوت بن جاتی ہے اور اس کی عاقبت کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی
ہے۔ اس آیت میں اسی حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع
میں اسی فطری محبت کا ذکر ایک مثبت انداز سے ہوا ہے۔ ایک بندہ مؤمن کے دل میں یہ
فطری تمنا ہوتی ہے کہ اس کے اہل و عیال بھی ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی روش
اختیار کریں۔ یہ تمنا اور آرزو اس قرآنی دعا کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنۡ أَرْوَاجِنَا وَفُرُشَاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا
لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا﴾ (الفرقان)

”جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی
اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔“

یہی مضمون سورۃ التحریم کی زیر نظر آیت میں اپنی منطقی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ یعنی ایک

مسلمان کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے نان نفقہ کا اہتمام کرے انہیں کھلائے پلائے ان کے رہن سہن کی ضرورتیں پوری کرے۔ یہ تو جبلی طور پر ہر انسان کرتا ہے۔ ایک خاندان کے سربراہ کے مؤمن و مسلم ہونے کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ اللہ نے اپنی مخلوق میں سے جن کو بطور امانت اس کے حوالے کیا ہے وہ ان کے صحیح حقوق کی ادائیگی کی فکر کرے۔ اس امانت کا حق اس طرح ادا ہوگا کہ ان کی بہتر سے بہتر دینی تربیت کی کوشش کرے تاکہ وہ صحیح رُخ پر پروان چڑھیں۔ لیکن اگر اسے اس ذمہ داری کا احساس نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ایک مسلمان خاندان کا سربراہ اپنی ذمہ داری کو بحیثیت ایک مسلمان ادا نہیں کر رہا۔

اس طرف متوجہ کرنے کے لیے قرآن مجید کا انداز بڑا فطری ہے۔ تنبیہ کا آغاز ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ﴾ ”اے اہل ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو“ کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں قیامت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے کہ اُس روز ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہوگی۔ اُس وقت ہر شخص بھول جائے گا کہ کون میرا بیٹا ہے، کون میری بیوی ہے اور کون میرا باپ ہے! سورہ بئس میں آتا ہے: ﴿فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاعِقَةُ ۗ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۗ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۗ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۗ﴾ ”آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز ہوگی۔ اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔“ اور سورہ المعارج میں فرمایا گیا کہ:

﴿وَلَا يَسْتَلِ حِمِيمٌ حَمِيمًا ۗ يُصْرَوْنَهُمْ ۗ يَوْمَ الْمُجْرِمِ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِنِيهِ ۗ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۗ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤَيِّبُهَا ۗ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۗ﴾

”اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا، حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو اپنی بیوی کو اپنے بھائی کو اور اپنے قریب ترین خاندان کو جو اُسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدویہ میں دے دے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔“

اسی لیے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ”بچاؤ اپنے آپ کو“۔ اور اس کے بعد اپنے قریب ترین افراد یعنی اہل خانہ جن سے انسان کو بہت محبت ہوتی ہے، کو اس آگ سے بچانے کی ہدایت کی جا رہی ہے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

اس سورہ مبارکہ کے خاص اسلوب سے اس آیت کا جو ربط و تعلق ہے اسے اس مقام پر نوٹ کر لیجیے۔ ہر سورہ مبارکہ کا ایک عمود یعنی ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جس کے ساتھ سورت کی ہر آیت منسلک اور مربوط ہوتی ہے۔ یہاں بھی دیکھئے کہ اولاد کی تربیت میں بسا اوقات لاڈ پیار حائل ہو جاتا ہے جو اولاد کے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔ آپ بچے کی صبح کی میٹھی نیند میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے، اس لیے اسے فجر کی نماز وقت پر ادا کرنے کا عادی نہیں بنا رہے۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ وہ سوتا رہے۔ اب اگر آپ کی اس بے جا شفقت و محبت کے نتیجے میں وہ بچہ بعد میں نماز کا پابند نہ ہو سکا تو آپ خود سوچئے کہ آپ نے اس کے حق میں کتنے کتنے بونٹے بودیے ہیں۔ اس کی تربیت اس طرح کس جاہلی کے رُخ پر ہو رہی ہے اور اس کی زندگی عاقبت کے اعتبار سے کس خسارے کی راہ پر گامزن ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر اپنی بیویوں کے ساتھ لاڈ پیار اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اللہ کے احکام میں خلل پیدا ہو رہا ہے، حدود اللہ ٹوٹ رہی ہیں، اللہ کا تقویٰ نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے اور اس سے دل غافل ہو رہے ہیں تو اچھی طرح جان لیجیے کہ آپ کی طرف سے آپ کی یہ محبت نہ آپ کے حق میں نافع ہے اور نہ ان کے حق میں بلکہ یہ دونوں کے لیے عداوت ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ایک نہایت جامع قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا ہے: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْتَوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))^(۱) ”تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے ریوڑ کے بارے میں جواب دہ ہے“۔ جس طرح ایک چرواہا اور گلہ بان ان مویشیوں کی حفاظت کا ذمہ دار اور

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب المرأة راعية في بيت زوجها و متعدد دیگر مقامات۔
و صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضيلة الامام العادل.....

مسئول ہوتا ہے جو اس کے چارج میں دیے گئے ہیں اور اس میں سے اگر کوئی جانور گم ہو جائے یا حادثہ کا شکار ہو جائے تو اُس چرواہے کا محاسبہ ہوتا ہے کہ اس جانور کی گمشدگی میں اس کی غفلت کا کتنا دخل ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر انسان کے حوالے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد کر دیے ہیں۔ اگر کوئی کسی دفتر میں افسر ہے تو جو اُس کے ماتحت ہیں وہ گویا ایک گلہ ہے جس کا وہ نگہبان ہے۔ اس کو اپنی حیثیت کے تناسب سے اپنے ماتحتوں کے دین و ایمان اور ان کی سیرت و کردار کے بارے میں فکر مند رہنا چاہیے کہ یہ چیزیں صحیح رُخ پر ہیں کیونکہ وہ ذمہ دار اور مسئول ہے۔ اور خاندان کے سربراہ پر تو یہ اصول صد فیصد راست آتا ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے ذمہ دار اور مسئول ہے۔

صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنے گھرانے کے قریب ترین افراد کو لے کر بیٹھتے تھے اور خصوصاً خواتین کا نام لے کر انہیں نصیحت فرماتے تھے۔ مثلاً اپنی لخت جگر نورِ نظر حضرت فاطمہؓ سے بیٹھنا سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

”اے فاطمہ! محمد (ﷺ) کی لخت جگر! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس لیے کہ اللہ کے ہاں تمہارے باب میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔“

حضرت صفیہؓ سے فرمایا:

”اے صفیہ! اللہ کے رسول کی پھوپھی! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو اس لیے کہ اللہ کے ہاں تمہارے بارے میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔“

تو یہ ہے اللہ کے رسول ﷺ کا متوجہ کرنے اور ترغیب و ترہیب کا انداز۔ ہر مسلمان گھرانے کے سربراہ کا یہ وہ مثبت رول ہے جسے اپنے اہل و عیال کے ضمن میں ادا کرنے کے لیے اسے فکر مند رہنا چاہیے۔

اب دیکھئے کہ یہ بڑا لطیف اور بلینغ از از اختیار فرمایا گیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو اس آگ سے بچانے کی فکر کرو جس کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ پتھروں کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔

انسان جب جہنم میں جھونکے جائیں گے تو گویا وہ اس کا ایندھن ہوں گے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ پتھروں کے ذکر میں کیا حکمت ہے! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذکر اس اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس آگ کی شدت و حرارت کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک آگ تو وہ ہے جو لکڑیوں سے جلائی جاتی ہے اور ایک آگ وہ ہے جو پتھروں سے جلیے گی۔ پتھر کے کونکوں سے کسی زمانہ میں جو آگ جلا کرتی تھی اس کی حرارت کا ذرا تصور کیجئے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر سوچئے کہ اصل پتھر جس آگ کا ایندھن بن رہے ہوں اس کی شدت و تیزی اور شدت کا کیا عالم ہوگا! — اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ بُت عموماً پتھروں سے تراشے جاتے ہیں اور انہیں معبود سمجھا جاتا ہے ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں ان کے آگے ماتھایا جاتا ہے ان سے حاجت روائی کے لیے دعائیں کی جاتی ہیں اس لیے مشرکوں کے ساتھ پتھروں کے یہ بُت بھی جہنم میں جھونک دیے جائیں گے تاکہ ان کی حسرت میں مزید اضافہ ہو کہ جنہیں ہم معبود سمجھے بیٹھے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ اس آگ میں جل رہے ہیں۔

آگے فرمایا: ”اس جہنم پر وہ فرشتے مامور ہیں جو بڑے سخت دل اور تند خو ہیں۔“ غور کیجئے! بہت ہی لطیف انداز ہے کہ آج تم بڑی محبت، شفقت اور لاڈ پیار کی وجہ سے اپنی اولاد کو بگاڑ رہے ہو، لیکن نتیجہ کے طور پر وہ ان شدت خوار سخت گیر فرشتوں کے حوالے ہوں گے جو جہنم کے کارندے اور داروغے ہیں اور ان کے دلوں میں کوئی نرمی اور محبت نہیں ہے۔ تمہاری یہ چہیتی اولاد کتنی ہی فریاد کرے ان فرشتوں کے دل پسچیں گے نہیں۔ ان کے دل میں رحم اور رأفت کا جذبہ رکھا ہی نہیں گیا۔ وہ بڑے سخت دل اور شدید خو ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ ”وہ اللہ کی طرف سے ملنے والے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے“ اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے۔“

ان آیات سے فرشتوں پر ایمان کے بارے میں بھی رہنمائی ملتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فرشتوں پر ایمان ہمارے ایمانیات کا لازمی حصہ ہے۔ دنیا میں دیویوں اور دیوتاؤں کے تصورات درحقیقت ”فرشتوں پر ایمان“ ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس

تصور میں بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ فرشتوں کو بااختیار سمجھ لیا گیا۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ اگرچہ ملائکہ ایک نوری مخلوق ہیں اور ان کا رتبہ بہت بلند ہے لیکن وہ بااختیار مخلوق نہیں۔ اسی بات کو یہاں ان الفاظ مبارکہ سے واضح کیا گیا کہ: ﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ (۱) جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو اب ان کو پکارنا بے کاران سے دعا کرنا لا حاصل اور ان کو پوجنا بے فائدہ — لہذا اللہ کو پکارو اللہ سے دعا کرو اللہ سے مدد مانگو۔ اللہ تعالیٰ جس ذریعے سے چاہے آپ کی ضرورت پوری کر دے۔ وہ کسی انسان کے دل میں ڈال دے، کسی فرشتہ کو مامور کر دے، یہ اس کا اختیار مطلق ہے۔ فرشتے اس اعتبار سے ایک مجبور اور ناچار مخلوق ہیں کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی بڑی خوبصورت وضاحت سورہ مریم میں آئی ہے۔ متعلقہ آیت کے بین السطور سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے شکوہ کیا کہ اے جبریل! آپ وقفہ وقفہ سے آتے ہیں ہمیں انتظار رہتا ہے۔ اس شکوہ کا حضرت جبریل سے اللہ تعالیٰ نے جواب دلویا کہ ﴿وَمَا نَنْزِلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ (۲) اور (اے نبی!) ہم آپ کے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے۔ یعنی نزول وحی میں وقفہ کسی بھول کے باعث نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی حکمت بالغہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اگلی آیت میں نقشہ کھینچا گیا کہ جب لاڈ پیار سے بگڑے تمہارے یہ لاڈلے اور پیارے جنہم میں جھونکے جائیں گے تو اُس وقت وہ معذرتیں کریں گے دہائیاں دیں گے اور چیخ و پکار کریں گے تو ان کو جواب دیا جائے گا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ﴾ (۳) اے ناشکرو! آج بہانے مت بناؤ (معذرتیں نہ تراشو)۔ اب اس کا کچھ حاصل نہیں۔ ﴿إِنَّمَا تُعْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۴) تمہیں بدلے میں وہی کچھ دیا جا رہا ہے جو تم کرتے تھے۔ یہ تمہارے اپنے اعمال ہیں۔ فرق صرف یہ

ہے کہ دنیا میں ان میں لذت اور سرور تھا۔ وہاں تمہاری بد اعمالیاں "sugar coated pills" کی حیثیت رکھتی تھیں جس کے باعث ان کی تلخی تم پر نمایاں نہیں ہوتی تھی اور جس انجام سے تمہیں دوچار ہونا تھا وہ تم پر واضح نہیں ہوتا تھا۔ تم نے اپنے افعال پر اپنی خواہشات نفس کی coating کر رکھی تھی اب وہ اتر گئی ہے لہذا اس کی حقیقی و واقعی تلخی کا مزا ہے جو تم یہاں چکھ رہے ہو۔ یہ تمہارے وہی اعمال ہیں جو آج تمہارے سامنے آ گئے ہیں۔ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی اور تمہارے اپنے کروت ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس انجام بد سے ہم سب کو بچائے۔ آمین!

تَوْبَةٌ نَّصُوحًا كَاهَارِے دین میں مقام

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا ۗ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُم جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۗ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَنْتُمْ لَنَا نُورٌ ۖ وَغُفِّرْنَا ۗ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفْرَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۗ وَمَا لَهُمْ فِي جَهَنَّمَ ۗ وَبَشِ الْمَصِيرِ ﴿١﴾

”اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔ امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم سے تمہاری برائیوں کو دور فرمادے گا اور تمہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ اُس دن اللہ ہرگز سوانہ کرے گا نہ اپنے نبی کو اور نہ ان کے ساتھی اہل ایمان کو۔ ان کا نور دوڑتا ہوا ہوگا ان کے سامنے بھی اور ان کے دائیں جانب بھی۔ اور وہ یہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے لیے ہمارے اس نور کو پورا فرمادے اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما یقیناً تجھے ہر شے پر قدرت اور ہر کام پر اختیار حاصل ہے۔ اے نبی (ﷺ)! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔“

ان میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ تمام اہل ایمان کو توبہ کا حکم دے رہے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ توبہ کی ترغیب دے رہے ہیں، لیکن توبہ وہ ہو جو خالص توبہ ہو جو خلوص دل سے کی گئی ہو جو صحیح معنی میں توبہ ہو۔ ہمارے اس سلسلہ دروس میں سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کے ضمن میں توبہ کے موضوع پر بڑی مفصل گفتگو ہو چکی ہے اور توبہ کا فلسفہ توبہ کی عظمت ہمارے دین کی حکمت میں اس کا مقام اور توبہ کے صحیح ہونے کے لیے شرائط جیسے تمام امور زیر بحث آچکے ہیں۔

موقع کی مناسبت سے میں یہاں ایک حدیث کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کی ایک تو متفق علیہ روایت ہے، یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے جبکہ ایک ذرا تفصیلی روایت صرف مسلم شریف میں ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ نے اس بات کو واضح فرمانے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے کسی بندے کی توبہ سے کتنی خوشی ہوتی ہے ایک تشبیہ بیان کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک ایسے شخص کا تصور کرو جو کسی لقمہ و دق صحرا میں تہا ستر کر رہا ہے اس کے پاس ایک اونٹنی ہے اسی پر اس کا زور اور یعنی راشن اور پانی وغیرہ ہے۔ وہ تھوڑی دیر سستانے کے لیے کسی درخت کے سایہ تلے بیٹھتا ہے اونٹنی بھی پاس ہی کھڑی ہے۔ وہاں پر اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ اسی اثناء میں اس کی اونٹنی غائب ہو جاتی ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیوانہ وار اونٹنی کی تلاش میں کبھی ادھر دوڑتا ہے، کبھی اُدھر بھاگتا ہے۔ اس کے اضطراب اور بیچاری کا آپ خود تصور کر سکتے ہیں اس لیے کہ وہ اونٹنی ہی درحقیقت اس کے لیے وسیلہ حیات اور ذریعہ زندگی ہے۔ وہی اس کی سواری ہے اسی پر اس کا کھانا اور پانی ہے۔ وہ ہر چہار طرف بھاگ دوڑ کرنے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ موت کے انتظار میں آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اچانک وہ آنکھیں کھولتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی اس کے پاس کھڑی ہے۔ اس پر وہ اپنی خوشی کی شدت کے باعث ایسا بوکھلا اٹھتا ہے کہ کہنا تو یہ چاہتا ہے کہ ”اے اللہ! تو میرا رب ہے، میں تیرا بندہ ہوں“ لیکن فرط جذبات سے اس کی زبان لڑکھراتی ہے اور اس سے الفاظ نکلتے ہیں ”اے پروردگار! میں تیرا رب

ہوں تو میرا بندہ ہے۔“ تصور کیجئے کہ اونٹنی دوبارہ پالینے پر اس شخص کی فرط مسرت کا کیا عالم ہے! نبی اکرم ﷺ یہ تشبیہ بیان کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ: ”اللہ کو اس سے بھی زیادہ خوشی اپنے کسی گنہگار بندے کی توبہ سے ہوتی ہے۔“ احادیث میں توبہ کی جو عظمت بیان ہوئی ہے اور جس قدر شد و مذمت کے ساتھ اس کی ترغیب دی گئی ہے اسے سامنے رکھئے اور پھر اس آیت کا مطالعہ کیجئے کہ تمام مسلمانوں سے خواہ وہ کسی زمان و مکان سے تعلق رکھتے ہوں، خطاب فرمایا جا رہا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ ”اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔“

توبہ کے ضمن میں دو مزید احادیث بھی پیش نظر رہنی چاہئیں: جن میں نبی اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں خود روزانہ ستر ستر اور سو سو بار اللہ کی جناب میں توبہ اور استغفار کرتا ہوں۔ ایک روایت صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کے الفاظ ہیں: ((وَاللَّهِ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً)) (۱) ”اللہ کی قسم! میں روزانہ ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ کی جناب میں استغفار بھی کرتا ہوں، توبہ بھی کرتا ہوں۔“ دوسری روایت صحیح مسلم میں ہے جس کی رو سے نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((يَا أَيُّهَا النَّاسُ، تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ، فَإِنِّي أَتُوبُ فِي الْيَوْمِ إِلَيْهِ مِائَةً مَرَّةً)) (۲) ”اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کرو اس لیے کہ میں خود اس کے حضور روزانہ سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں۔“ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی توبہ کے کیا معنی ہیں؟ حضور ﷺ سے کسی گناہ کے ارتکاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ لہذا اچھی طرح جان لیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کی توبہ اور آپ کے استغفار کا معنی و مفہوم کیا ہے! دراصل توبہ کے معنی ہیں رجوع کرنا، پلٹنا، لوٹنا۔ اس کے کم از کم چار درجے اگر ذہن میں رکھے جائیں تو بات واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص وہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب استغفار النبی ﷺ فی اليوم والميلة۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب استحباب الاستغفار والاستتجار منه۔

ہے جو کفر سے توبہ کرتا ہے اور اسلام میں آتا ہے۔ ایمان لانا بھی ایک نوع کی توبہ ہے۔ جیسے ہم سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں پڑھ آئے ہیں: ﴿لَا مَن قَاتَبَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾ دوسری توبہ کسی مسلمان شخص کی ہے جو معصیت سے توبہ کرتا ہے گناہ کو چھوڑ رہا ہے گناہ سے رجوع کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اطاعت کی طرف۔ تیسری توبہ ہوگی ابرار یعنی نیکو کاروں کی۔ کسی وقت ایک صالح اور نیک شخص کی قلبی کیفیت ایسی ہو سکتی ہے کہ معرفت الہی کے معاملے میں اس کے دل پر کچھ دیر کے لیے غفلت کا پردہ سا پڑ جائے۔ وہ محض غفلت ہے اس سے کسی معصیت کا ارتکاب نہیں ہوا۔ اسے محض یہ احساس ہوا کہ میرے قلب پر کچھ دیر کے لیے غفلت کا حجاب طاری رہا ہے۔ اب وہ غفلت سے استحضار اللہ فی القلب کی جانب رجوع کر رہا ہے دل میں اللہ کی یاد کو متحضر کرنے کے لیے اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو رہا ہے یہ بھی توبہ ہے۔ پھر ایک توبہ مقررین بارگاہ الہی کی ہے۔ یعنی اُن کے قلب کا جو مضبوط تعلق اور رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ استوار رہتا ہے اس کی شدت میں اگر کبھی کوئی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس حساسیت کے باعث وہ اس سے بھی توبہ کرتے ہیں اور اپنے تعلق مع اللہ کی اسی سابقہ شدت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ کیفیت جس کو مقررین یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی توبہ میں شمار کیا جاسکتا ہے کہ جب ان نفوس قدسیہ کو یہ محسوس ہو کہ کسی مصروفیت کے باعث ان کے تعلق مع اللہ کی شدت میں ذرا سی کمی ہو گئی ہے تو وہ اس سے بھی توبہ کرتے اور رجوع فرماتے ہیں۔

اس تناظر میں آپ سمجھئے کہ کوئی صاحب ایمان ایسا نہیں ہے جو اس حکم یا اس ترغیب کا مخاطب نہ ہو کہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں توبہ کرو خالص توبہ! خالص توبہ کون سی ہوگی؟ اس کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے کہ کم از کم تین شرطیں پوری ہوں تو وہ خالص توبہ ہوگی۔ اگر حقوق اللہ کے ضمن میں کوتاہی ہوئی ہے تو (۱) شدید پشیمانی ہو (۲) مہم ارادہ ہو کہ میں آئندہ اس کا ارتکاب نہیں کروں گا اور (۳) انسان اس گناہ کے کام کو فی الواقع چھوڑ دے۔ اور اگر

حقوق العباد کا معاملہ ہے تو حریز ایک شرط یہ ہوگی کہ یا تو اس شخص سے جس کی حق تلفی کی ہے معافی حاصل کرے یا اپنے کسی عمل سے اس کے نقصان کی تلافی کرے۔

اس خالص توبہ کا مقام اور مرتبہ کیا ہے! اسے اسی آیت میں آگے بیان فرمایا: ﴿عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾ عربی زبان میں ”عَسَىٰ“ اور ”لَعَلَّ“ کے الفاظ عام طور پر تو ”شاید“ کے معنی میں آتے ہیں لیکن قرآن مجید میں جب یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر وارد ہوتے ہیں تو شاہانہ انداز کلام کی رو سے اس کے معنی ہوتے ہیں ”تا کہ“ اور ”امید ہے کہ“ یعنی اس میں بشارت کا پہلو ہوتا ہے۔ لہذا ترجمہ یہ ہوگا کہ ”امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیوں کو دُور فرمادے گا“ ﴿وَيَذِخْرُكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ اور تمہیں اُن باغات میں داخل فرمائے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔“

آگے فرمایا کہ اُس دن یعنی قیامت کے روز سب کے لیے رسوائی ہوگی، صرف انبیاء کرام علیہم السلام ان کے پیروکار اور سب سے بڑھ کر انبی الخاتم جناب حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھی اہل ایمان اس رسوائی سے بچے ہوئے ہوں گے: ﴿يَوْمَ لَا يُغْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ﴾ آگے فرمایا: ﴿نُورُهُمْ يَسْطُرُ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ﴾ ”ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہوگا“— یہ بات جان لیجیے کہ انسان کے ایمان کا محل و مقام اس کا قلب ہے۔ ایمان حقیقت میں ایک روشنی ہے ایک نور ہے۔ یہ بات ہم سورۃ النور کی آیت نور کے حوالے سے پہلے اچھی طرح سمجھ بھی چکے ہیں۔ اس قلب میں جو نور ایمان ہے وہ میدانِ حشر میں ظاہر ہو جائے گا اور اس کی روشنی انسان کے سامنے پڑے گی۔ اسی طرح انسان کے نیک اعمال میں بھی ایک نور امیت ہے۔ البتہ اس دنیا میں اس کا ظہور نہیں ہوتا، میدانِ حشر میں اس کا ظہور ہوگا۔ نیک کاموں کا کمانے والا عام طور پر انسان کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے لہذا میدانِ حشر میں انسان کے نیک اعمال کا نور اس کے داہنی جانب نمایاں ہوگا۔ ﴿نُورُهُمْ يَسْطُرُ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ﴾ ”دوڑتا ہوگا ان کا نور ان کے آگے اور ان کی داہنی

طرف“۔ ﴿يَتَّقُونَ رَبَّنَا اتَّبِعُوا لَنَا نُؤَزِّقْكُمْ وَأَغْفِرْ لَكُمْ﴾ ”اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! (اگر ہمارے نور میں کچھ کمی رہ گئی ہے تو) ہمارے لیے ہمارے نور کو پورا کر دے اور ہم کو معاف کر دے“۔

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میدان حشر میں یہ نور ہر شخص کو اُس کے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ملے گا۔ ایمان کے بھی مدارج و مراتب ہیں۔ ایک ایمان حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے اور ایک ہاشم کا ایمان ہے۔ ان کے مابین ظاہر ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر ہمیں ایمان کی ذرا سی رمت بھی میسر ہو تو وہ بھی ہمارے لیے بہت بڑی کامیابی ہے۔ کہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نور ایمان اور کہاں ہمارا ایمان! حضور ﷺ نے فرمایا کہ اُس روز میدان حشر میں لوگوں کو جو نور ملے گا تو کسی کا نور اتنا ہو گا کہ جیسے وہ مدینہ میں ہو اور اس کی روشنی صنعاء (یعنی کے دار الحکومت) تک پہنچ جائے اور کسی کا نور بس اس قدر ہو گا کہ اس کے قدموں کے سامنے روشنی ہو جائے۔ جن کو اُس روز اتنا نور مل جائے وہ بھی بڑے نصیب والے اور کامیاب و کامران لوگ شمار ہوں گے، کیونکہ وہ اس کٹھن اور سخت مرحلہ سے گزر جائیں گے جس سے آگے ان کی منزل مراد یعنی جنت ہے۔ کم نور والوں کے نور کی حیثیت گویا اس نارِ حشر کی روشنی کی سی ہوگی جس کو لے کر انسان کسی پگڈنڈی پر چل تو لیتا ہے۔ پس اس کٹھن مرحلہ کے لیے فرمایا کہ وہ لوگ دعا کر رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارے نور میں ہماری کوتاہیوں کے باعث کمی رہ گئی ہے، پس تو ہمارے اس نور کا اتمام فرما دے اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمیں بخش دے۔ یہ ہمارے گناہ ہیں جن کی وجہ سے ہماری نورانیت میں کمی رہ گئی ہے، تو اپنے خاص خزانہ فضل سے اپنے خصوصی اختیار سے اس کمی اور تقصیر کی عطا فرما دے، اس لیے کہ ﴿اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌۭ﴾ ﴿٨﴾ ”یقیناً تجھے ہر شے کا اختیار حاصل ہے“۔

اس کے بعد اگلی آیت میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب ہے اور بظاہر یہ آیت اس سورت کے مضامین سے غیر متعلق سی معلوم ہوتی ہے۔ ابھی تک ساری باتیں

آنحضور ﷺ کے گمراہوں سے متعلق اہل ایمان سے متعلق اور مسلمانوں کے عالمی نظام سے متعلق تھیں، لیکن یہاں یہ بات فرمائی گئی کہ: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفْرَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ ”اے نبی (ﷺ)! آپ کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سخت کیجئے“۔ وہ آپ کی نرمی، آپ کی مروت، آپ کی شفقت اور آپ کی رحمت عمومی سے فائدہ اٹھانے نہ پائیں۔ وہ تو غلظت اور سختی کے مستوجب ہو چکے ہیں۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

یہ آیت لیجئے، انہی الفاظ کے ساتھ سورۃ التوبہ (آیت ۷۳) میں بھی وارد ہوئی ہے۔ سورۃ التحریم کے مضامین سے اس آیت کا بڑا لطیف ربط ہے۔ دراصل اس سورۃ مبارکہ کا مرکزی مضمون (Axis) یہ ہے کہ نرمی، شفقت، دلجوئی، کسی کے جذبات کا لحاظ اور پاس کرنا یہی نفع ہے، تو بہت اچھی باتیں ہیں، بہت مطلوب اور پسندیدہ ہیں، لیکن اگر ان میں حدِ اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہ چیز مختلف پہلوؤں سے خرابیاں پیدا ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ اولاد کے ساتھ بے جالا ڈ پیار اور بے جا نرمی کا معاملہ ہو تو اس کے بے راہ اور آوارہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ وہاں بھی نرمی مطلوب تو ہے، لیکن ایک حد تک۔ اسی طرح جب انسان اپنے نفس کے معاملہ میں نرمی کرتا ہے تو خرابی کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ چونکہ ہمارا دین دینِ فطرت ہے، لہذا اس میں ہمارے اوپر اپنے نفس کے حقوق بھی معین کیے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((وَأَنَّ لِنَفْسِكَ [عَلَيْكَ حَقًّا])^(۱) ”اور بے شک تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے“۔ اس پر بے جا سختی پسندیدہ نہیں ہے۔ ہمارے دین میں رہبانیت جائز نہیں ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ))^(۲) ہمارے دین میں نفس کشی کی اجازت نہیں ہے، بلکہ ضبط نفس کی ہدایت ہے کہ اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھو۔ لیکن نفس کو بالکل کچل ڈالنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کے تقاضوں کو صحت مند اور جائز و حلال ذرائع سے پورا کرنے کی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب ما يكره من ترك قيام الليل لمن كان يقومه۔ وسنن

الترمذی، کتاب الزهد عن رسول اللہ ﷺ، باب منه۔

(۲) فتح الباری لابن حجر، ۱۳/۹۔

اجازت ہے۔ اس نفس کے جو تقاضے ہیں وہ تمدن کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے ضروری ہیں لہذا اس پر بھی نرمی کرو۔ لیکن اگر یہ نرمی حد اعتدال سے تجاوز کر جائے گی تو معصیت کی طرف لے جائے گی لہذا اس کی باکیں تمام کر اور کھینچ کر رکھو۔ اسی طرح کا معاملہ کفار اور منافقین کا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی نرمی تمہارے دل میں نہ ہو۔ اہل ایمان کی جو شان قرآن مجید میں ایک سے زائد مقام پر آئی ہے وہ ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ وَرَحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ کی شان ہے۔ یعنی وہ کفار کے حق میں نہایت سخت ہوتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے نہایت رحیم و شفیق ہوتے ہیں۔ کفار کے لیے سختی کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہ کہیں مسلمانوں کے جسد ملی میں انگلی نہ دھنسا سکیں، وہ مسلمانوں کو نرم چارہ نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس تناظر میں نبی اکرم ﷺ کا معاملہ دیکھئے کہ آپ سر اپارحمت و شفقت ہیں۔ آپ کی یہ شان خود اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ آپ رؤف و رحیم ہیں آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔ آپ میں نرمی رقت قلب اور خلق خدا کے حق میں رافت و رحمت کا معاملہ کوٹ کوٹ کر بھر ہوا ہے۔ لہذا بسا اوقات اس سے کفار و مشرکین اور منافقین نا جائز فائدہ اٹھا جاتے تھے۔ چنانچہ آپ سے فرمایا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ①﴾

معلوم ہوا کہ اس سورہ مبارکہ کا جو مرکزی خیال ہے اس کے ساتھ یہ آیت بھی مربوط ہے اگرچہ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس سورت کے سیاق و سباق سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔

عورت کا روحانی و اخلاقی تشخص

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتٍ نُوحٍ وَامْرَأَتٍ لُوطٍ ۗ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحِينَ فَخَانَتُهُمَا فَلَمْ يُغْنِ عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِينَ ②﴾ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتٍ فِرْعَوْنَ ۖ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِنَ

فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجَّيْنَا مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿١٠﴾ وَمَرِّمَ ابْنَتِ عِمْرَانَ الَّتِي
 أَحْضَنَتْ لِرَبِّهَا فَنفَعْنَا لِيَهِيَ مِنْ رَبِّنَا وَصَلَّاتٍ بِكَلِمَاتٍ رَبَّهَا وَكُنَّ بِه
 وَكَانَتْ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿١١﴾

”اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے کافروں کے لیے نوح اور لوط (علیہم السلام) کی بیویوں کی۔ وہ دونوں ہمارے دو نہایت نیک بندوں کے عقد میں تھیں تو انہوں نے ان سے خیانت کی روش اختیار کی تو وہ دونوں ان (اپنی بیویوں) کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے اور یہ کہہ دیا گیا (ان بیویوں سے) کہ تم دونوں داخل ہو جاؤ آگ میں دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ۔ اور اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے اہل ایمان کے لیے فرعون کی بیوی کی۔ جبکہ اس نے کہا ہے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس ایک گھر جنت میں بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے نجات بخش ظالموں کی قوم سے۔ اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال بیان فرمائی ہے جس نے اپنی صحت کی پوری حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور اس نے تصدیق کی اپنے رب کی تمام باتوں کی اور اس کی کتابوں کی اور وہ ہمارے بہت ہی فرمانبردار بندوں میں سے تھی۔“

یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ سورۃ التحریم میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی پہلی منزل یعنی مرد اور عورت کے مابین رخصتہ ازدواج کہ جس سے خاندان کے ادارہ کی بنیاد پڑتی ہے کے ضمن میں نہایت اہم اور بنیادی ہدایات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ عائلی زندگی کے بارے میں ایک نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ عورت کا مقام کیا ہے! آپ کو معلوم ہے کہ اس ضمن میں اس دنیا میں بہت افراط و تفریط رہی ہے۔ عورت کو یا تو بالکل بھیڑ بکری کی طرح ایک ملکیت قرار دیا گیا، ہمارے ہاں بول چال کے عام محاورے میں اسے جوتی کی ٹوک سے تعبیر کیا گیا یا پھر اسے بازار میں لا بیٹھایا گیا اور کبھی اسے گلو پلہرہ کاروپ دھار کر قوموں کی قسمتوں سے کھیلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ یہ افراط و تفریط ہے جس میں نوع انسانی بالعموم مبتلا رہی ہے۔ اسلام نے عورت کو

ایک مکمل قانونی اور اخلاقی تشخص عطا کیا، پھر اس کے دائرہ عمل اور میدان کار کا تعین کیا۔ اسلام کی رو سے عورت کا ایک علیحدہ قانونی وجود ہے۔ چنانچہ اس کے قانونی حقوق ہیں۔ عورت کی اپنی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے اور وہ اپنی اس ملکیت میں تصرف کا کامل اختیار رکھتی ہے۔ لہذا عام انسانی حقوق کے اعتبار سے مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اس ضمن میں نہایت قابل غور پہلو یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو قانونی تشخص دینے کے ساتھ ساتھ اخلاقی تشخص بھی عطا کیا ہے۔ عورت اگر کوئی نیک کام کرتی ہے تو اس کا اجر و ثواب اُس کے لیے ہے۔ وہ اس معاملے میں مردوں کے تابع نہیں ہے۔ چنانچہ شوہر اپنی بیوی کے نان و نفقہ کا کفیل اور ذمہ دار تو ہے، لیکن اس کے دین و اخلاق کا کفیل اور ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر عورت میں نیکی اور بھلائی ہوگی تو وہ اس کے لیے ہے عورت کوئی خیر کمائے گی تو اُس کا صلہ اور اجر و ثواب اسی کو ملے گا۔ اسی طرح اگر مرد کوئی نیکی کماتا ہے تو اُس کا اجر و ثواب اسی کے لیے ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید نے یہ اصل الاصول بیان کیا ہے کہ ﴿لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى﴾ (النجم) ”کسی انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہی کچھ جس کے لیے اس نے محنت کی ہے“۔ جس کے لیے اس نے مشقت اور بھاگ دوڑ کی ہے۔

پھر یہ کہ انسان ہونے کے ناطے سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۹۵ میں فرمایا گیا: ﴿أَتَىٰ لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ ۖ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ﴾ ”میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے کسی بھی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ وہ (عمل کرنے والا) مرد ہو یا عورت ہو، تم ایک دوسرے ہی سے ہو“۔ یعنی مرد و عورت کا فرق و تفاوت خواہ جسمانی ہو خواہ نفسیاتی ساخت کے اعتبار سے ہو یہ فرق تو ہم نے تمدنی ضروریات کے تحت رکھا ہے باقی انسان ہونے کے اعتبار سے تم ایک دوسرے ہی سے ہو۔

یہی اصول قرآن مجید میں سورہ النساء کی آیت ۳۲ میں نہایت واضح شکل میں سامنے

آتا ہے: ﴿لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا۟ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبْنَ﴾^(۱) ”مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو کمائی انہوں نے کی اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو کمائی انہوں نے کی“۔ یعنی جو بھلائیاں، نیکیاں، خیرات اور حسنت مردوں نے اپنی محنت اور مشقت سے کمائی ہیں، ان کا اجر و ثواب ان کے لیے ہے اور جو بھلائیاں اور نیکیاں عورتوں نے کمائی ہیں، ان کا اجر و ثواب ان کے لیے ہے۔ اسی طرح جو برائی اور بدی مرد کمائے گا اس کا وبال اس پر ہوگا اور جو بدی اور برائی عورت کمائے گی اس کی پاداش اس کو بھگتنی ہوگی۔

اس اصول کو سورۃ التحریم کی آخری تین آیات میں تین مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ خواتین کہیں اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ ان کے شوہر ان کے دین و اخلاق کے بھی کفیل ہیں اور وہ دین و اخلاق کے معاملہ میں مردوں کے تابع ہیں۔ چنانچہ پہلی مثال دو ایسی عورتوں کی پیش کی گئی جن کے شوہر اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر رسول تھے ایک حضرت نوح اور دوسرے حضرت لوط علیہ السلام۔ ان دونوں کی بیویوں کا ذکر کیا گیا کہ دین کے اعتبار سے ان کا معاملہ درست نہ تھا۔ انہوں نے اپنے شوہروں کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ ان سے لازمی طور پر کوئی اخلاقی لغزش سرزد ہوئی ہو۔ اپنے شوہروں کے رازوں کا افشا بھی ایک خیانت اور بے وفائی کا عمل ہے۔ اس لیے کہ سورۃ النساء کی آیت ۳۴ میں جہاں یہ اصل الاصول بیان کیا گیا کہ ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ یعنی مرد عورتوں پر نگران اور حاکم ہیں، وہاں ایک مثالی (ideal) بیوی کے یہ اوصاف بھی بیان فرمائے گئے ہیں کہ ﴿فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ﴾ ”پس نیک بیویاں وہ ہیں جو فرمانبرداری کی روش اختیار کریں (اپنے شوہروں کا کہنا مانیں اور ان کے) رازوں کی پوری حفاظت کریں“۔ ظاہر بات ہے کہ بیوی سے زیادہ مرد کا راز دار اور کون ہوگا! مرد میں اگر کوئی خامی ہے، اگر کسی پہلو سے اس میں کوئی پوشیدہ جسمانی عیب ہے تو اسے اس کی بیوی سے بڑھ کر جاننے والا اور کوئی نہیں۔ گویا مرد کی پوری شخصیت عورت کے پاس بطور امانت ہے۔ راز کو بھی امانت

کہا گیا ہے۔ لہذا اگر شوہر نے کوئی راز کی بات بیوی کو بتائی ہو اور بیوی اس راز کو افشا کر دے تو یہ بھی خیانت ہے۔ چنانچہ ”فَمَخَانَهُمَا“ کے لفظ سے یہ لازمی نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ ان دونوں جلیل القدر رسولوں کی بیویاں بد چلن اور بد کار تھیں (معاذ اللہ)۔ قرآن مجید کے اصول کو اگر پیش نظر رکھیں تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ کسی رسول کے حبلہ عقد میں کوئی بد چلن اور بد کار عورت ہو۔ لہذا ان خواتین کا یہ طرز عمل کہ وہ در پردہ اپنی کافر قوموں کے ساتھ تھیں اور ان کی ہمدردیاں کفار کے ساتھ تھیں اسے یہاں خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن یہاں جو اصل بات واضح کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ دونوں عورتیں ہمارے رسولوں کے حبلہ عقد میں تھیں لیکن چونکہ ان دونوں کے اپنے اعمال درست نہ تھے لہذا ان کا انجام کافروں کے ساتھ ہوگا اور رسول کی زوجیت میں ہونا انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ چنانچہ فرمایا گیا: (وَلَقَدْ اِذْخَلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ﴿۱۵﴾) ”اور ان سے کہہ دیا گیا دوزخ میں داخل ہو جاؤ دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ“۔ یہاں ”قَوْلٌ“ فعل ماضی مجہول ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی قیامت کے حالات کا ذکر ہوتا ہے وہاں عام طور پر فعل ماضی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ فعل ماضی میں قطعیت و حمیت ہوتی ہے کہ کوئی کام ہو چکا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جتنی جتنی بات وہ ہوتی ہے جو وقوع پذیر ہو چکی ہو اتنی ہی جتنی بات قیامت و آخرت کی ہے۔ لہذا آخرت کے احوال بیان کرتے ہوئے قرآن مجید عام طور پر ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ یہاں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ اس میں عالم برزخ میں یہ بات کہی جانے کی طرف اشارہ ہو، واللہ اعلم بالصواب، لیکن یہاں جس حقیقت کی طرف نشاندہی مقصود ہے وہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث کے حوالے سے بھی ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی نعت جگر نور نظر حضرت قاطمہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا تھا کہ اے قاطمہ! محمد (ﷺ) کی بیٹی! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ اس لیے کہ مجھے تمہارے بارے میں اللہ کے یہاں کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ حضرت نوح اور

حضرت لوط (علیہ السلام) جیسے جلیل القدر پیغمبر آخرت میں اپنی بیویوں کے کام نہ آسکیں گے۔ یہ مثال بیان ہوئی ان دو عورتوں کی جو دو بہترین شوہروں کے حوالہ عقد میں تھیں، لیکن چونکہ وہ خود اہل ایمان میں سے نہ تھیں لہذا ان کے شوہروں کی نیکی اور بزرگی انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔

اب اس کے برعکس ایک مثال ایک بدترین شخص کے نکاح میں ایک نہایت نیک اور صالحہ خاتون کی آ رہی ہے۔ فرعون جیسے سرکش و متروک اللہ کے باغی اور خدائی کے مدعی شخص کے عقد میں حضرت آسیہ (علیہا السلام) تھیں۔ اغلباً یہ وہی خاتون ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو دریا میں بہتے ہوئے صندوق سے نکالا تھا اور فرعون کو آمادہ کر لیا تھا کہ ان کی پرورش وہ خود کریں گی۔ وہ یقیناً بنی اسرائیل کی کوئی مومنہ و صالحہ خاتون تھیں جو فرعون کی بیوی تھیں۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ ان کی نیکی کا یہ عالم تھا کہ فرعون کا محل اور وہاں کی آسائشیں اور سہولتیں نیز وہاں کا آرام گویا ان کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ شوہر کی مخالفت اس کی گمراہی و بے راہ روی اور اس کی بد اعمالیوں کی وجہ سے وہ عیش و آرام جو شاہی محل کا جزو لاینفک ہوتا ہے ان پر دو بھرتا۔ چنانچہ ان کی دعا قرآن نے ہاں الفاظ نقل کی ہے: ﴿رَبِّ اٰنِیْ لِیْ عِنْدَکَ مِثَاقِی الْمُبْتَلٰی وَتَجِیْبِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَوَعْمَلِہٖ وَتَجِیْبِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ①﴾ یعنی پروردگار! مجھے جلد سے جلد فرعون سے اس کے عمل سے اور ظالم و مشرک قوم سے نجات دے کر اپنے پاس بلا اور اپنے جوار رحمت یعنی جنت میں میرے لیے گھر بنا۔ اس دوسری مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی عورت کا شوہر خواہ کتنا ہی بد کردار یا کافر و مشرک ہو اگر وہ عورت خود مومنہ اور صالحہ ہے تو اس کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ شوہر کی برائی اسے کچھ نقصان نہ پہنچائے گی۔

اب اس ضمن میں تیسری مثال ایک ایسی خاتون کی آ رہی ہے کہ جنہیں ماحول بھی بہترین ملا اور پھر جن کے اپنے اندر بھی نیکی، بھلائی اور حسنات کے بہترین رجحانات اور میلانات تمام و کمال موجود تھے۔ گویا وہ نُوْرٌ عَلِیُّ نُوْرٍ کی مثال ہیں۔ پہلی مثال

بہترین شوہروں کے گھروں میں بدترین بیویوں کی تھی۔ دوسری مثال اس کے برعکس ایک بدترین شوہر کے عقد میں ایک بہترین خاتون کی تھی — اور اب تیسری مثال حضرت مریم سلام علیہا کی آرہی ہے جو خود بھی نیک صالحہ اور عبادت گزار تھیں پھر ان کی والدہ بھی اس قدر نیک تھیں کہ انہوں نے ان کی پیدائش سے پہلے ہی اپنی ہونے والی اولاد کو اللہ کی نذر کر دیا تھا جس کا ذکر سورہ آل عمران کی آیت ۳۵ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿رَبِّ اِنِّیْ قَلَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مَحْضُوْرًا﴾ ”اے میرے رب! میں نے تیرے لیے نذر کیا جو کچھ میرے پیٹ میں ہے دنیا کے تمام بکھیڑوں سے اسے چھکارا دلاتے ہوئے“۔ یعنی میں اس کو صرف تیرے دین کی خدمت کے لیے وقف کرنے کا عہد کرتی ہوں۔ تو یہ خاتون ہیں جن کی آغوش میں حضرت مریم نے پرورش پائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو ان کا مربی اور کفیل بنایا جو اللہ کے جلیل القدر نبی اور پیکر سلیمانی (بیت المقدس) کے مجاور اور نگران بھی تھے اور رشتے میں حضرت مریم کے خالوتھے۔ تو گویا یہ نوزد علی نوذ کا معاملہ ہے۔ ایک طرف حضرت مریم سلام علیہا کی سیرت اور ان کا کردار ہے جس کی اللہ تعالیٰ مدح فرما رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی عصمت و عفت کی کامل طور پر حفاظت کی۔ پھر امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑی آزمائش سے دوچار فرمایا۔ ایک نوجوان خاتون جو ناکھدا ہو جس کی شادی نہ ہوئی ہو اور وہ حاملہ ہو جائے آپ خود سوچئے کہ معاشرہ میں کیسی رسوائی کا سامان ہے جو ان کے لیے فراہم ہو گیا! اللہ تعالیٰ نے انہیں کس شدید آزمائش میں مبتلا کیا! لیکن اس اللہ کی بندی نے اپنے رب کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا ﴿وَصَلَّاتٌ مَّکْتُومٍ رَّبِّهَا وَحُجْبَةٍ﴾ یہ ان کی زندگی کا نقشہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے تمام احکام کی تعمیل کی۔ پھر انہوں نے تمام آسمانی کتابوں کی بھی تصدیق کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم و دینیہ سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ آیت کے آخر میں اُن کی مدح ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی گئی: ﴿وَوَکَانَ مِنَ الظَّالِمِیْنَ﴾ ”اور وہ اللہ کے فرماں برداروں میں سے (ایک بندی) تھی“۔

غور کیجئے کہ یہاں تین مثالوں کے ذریعے تین ممکنہ صورتوں کو بیان کر دیا گیا۔ لیکن ایک امکان ابھی باقی ہے۔ گویا اس عمارت کا ایک کونہ ابھی خالی ہے۔ بہترین شوہروں کے ہاں بدترین عورتوں کی مثال حضرت نوح اور حضرت لوط علیہم السلام کی بیویاں ہیں۔ بدترین شوہر کے ہاں بہترین خاتون کی مثال حضرت آسیہ ہیں، جبکہ بہترین ماحول میں بہترین خاتون کی مثال حضرت مریم ہیں۔ اب ایک مثال رہ جاتی ہے کہ شوہر بھی بدترین ہو اور بیوی بھی۔ گویا (ظَلُمْتُ بَعْضَهَا فَوْقَ بَعْضٍ) کا نقشہ ہو جسے ہم اپنے معاشرے میں کہتے ہیں کہ کریلا اور پھر نیم چڑھا۔ اس کی مثال ہمیں قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر ملتی ہے اور وہ ہے سورۃ اللہب۔ اس سورۃ مبارکہ میں ابولہب اور اس کی بیوی دونوں کا ذکر ہے:

(كَلْبَتْ يَدَا أَيِّ لَهَبٍ وَتَبَّ ۝ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۝
سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ لِي فِي جَهَنَّمَ
حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۝)

اس سورۃ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کے چچا ابولہب اور آپ کی چچی (ابولہب کی بیوی) اُمّ جمیل کی آنحضرت ﷺ سے عداوت کا بیان ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو نبی اکرم ﷺ سے زیادہ عداوت، بغض اور دشمنی تھی، کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آنحضرت ﷺ کی دشمنی، عداوت اور ایذا رسانی میں پیش پیش تھے۔ تو سورۃ اللہب میں بدترین شوہر اور بدترین بیوی کی مثال موجود ہے۔ اس طرح یہ کونہ اور گوشہ بھی پُر ہو جاتا ہے کہ شوہر بھی بدترین ہو اور بیوی بھی بدترین ہو تو اس کی صورت کیا ہوگی۔ چنانچہ ان کے بارے میں اسی دنیا میں جہنم کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

اب ان چاروں مثالوں کو سامنے رکھ کر جو نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ عورت کا اپنا ایک ذاتی تشخص ہے۔ اس معاملہ میں عورت لازماً اپنے شوہر کے تابع نہیں ہے۔ وہ دینی و اخلاقی طور پر ایک آزادانہ تشخص کی مالک ہے۔ اس کے اندر اگر بھلائی، نیکی اور خیر ہے تو وہ اسی

کے لیے ہے، لیکن برائی بدی اور سرکشی ہے تو اس کا وبال بھی اسی پر آئے گا۔ چونکہ اسلام کے عائلی نظام میں مالی اعتبار سے شوہر بیوی کا کفیل ہوتا ہے لہذا ہمارے ہاں بعض خواتین کو غیر شعوری طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ شاید نیک کام کرنا، بھلائیاں بکھانا اور دین کی خدمت کرنا یہ صرف مردوں کے کرنے کا کام ہے اور مرد اگر یہ کام کر لیں تو عورتوں کے لیے کفایت کرے گا۔ اس مغالطہ کی ان آیات مبارکہ کی روشنی میں مہمل اصلاح ہونی چاہیے۔ اس کے لیے پھر وہی الفاظ دہرا رہا ہوں جو سورۃ النساء کی آیت ۳۲ میں آئے کہ: ﴿لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾ جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے!“

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین



مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور — سرچشمہ یقین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکرانت کے فہم عناصر میں تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک پہنچانے

اور اس سطح

اسلام کی نشاۃ ثانیہ — اور — غلبہ دین حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو کے

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ